محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

(مخالفتوں کے طوفان سے گذرتے ہوئے)

مدنی دور

نعیم صدیقی

بسلسلہ گذشتہ

یہ نومسلم عالم چونکہ یہود کی کمزوریوں کے رازداں، ان کی حاسدانہ نفسیات اور ان کے ذلیل کردار کے رمز شناس تھے، اس لیے خوب سمجھتے تھے کہ میرے ذہنی انقلاب پر کیا تاثر دیا جائے گا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب مفاد پرستی کی بنا پر گروہ بندیاں پیدا ہوجاتی ہیں تو کردار اتنا گرجاتا ہے کہ اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہنے کے بجائے اپنے بُروں کو اچھا اور دوسروں کے اچھوں کو بُرا قرار دیا جاتا ہے اپنے باڑے کی بھیڑ کالی ہو تو بھی سفید شمار ہوتی ہے اور باہر کی بھیڑ سفید ہو تو بھی اسے کالی کہا جاتا ہے بلکہ اپنے باڑے کی سفید بھیڑ باڑھا ندکر باہر ہوتے ہی کالی ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ہر دور میں اس قماش کے مذہب داروں کا حال یہی رہا ہے کہ جب تک کوئی شخصیت ان کے ساتھ رہتی ہے یا کم سے کم اس سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ اس کی سرگرمیاں اپنے کاروبار پر اثر انداز ہونے والی ہیں تو اس کی خوبیوں کا خوب کھلے دل سے اعتراف کیا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھار تو پورے مبالغہ سے اس کی علمی و کرداری عظمت بیان کی جاتی ہے، لیکن وقت کی چند گردشوں کے ساتھ جب ایسی عظیم شخصیت کا بارٹ کسی بزرگ کی مذہبی مارکیٹ کے لیے ضرر رساں بن جاتا ہے، تو معاً رائے گرامی کروٹ لیتی ہے اور زبان و قلم پلٹی کھا جاتے ہیں۔ کوئی عالم تھا تو اب جاہل قرار پا جائے گا۔ مومن تھا تو اب فاسق وکافر گردانا جائے گا، خادمِ دین و ملت تھا تو اب وہ ضال ومضل گنا جائے گا، ادب واحترام کا مستحق تھا

نواب گالیوں کا ہدف بن جائے گا۔ عبد اللہ بن سلام کے سامنے یہود کی مسخ شدہ فطرت کی یہی پستیاں تھیں اور انھوں نے تہیہ کرلیا کہ ان پستیوں پر سے تصنع کے پردے اٹھوا دیئے جائیں۔ دل ہی دل میں ایک ڈرامے کا نقشہ بنا کر انھوں نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا۔ مناسب موقع پر محسنِ انسانیت کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یہود ایک باطل زدہ گروہ ہیں اور ان کے فسادِ احوال کو بے نقاب کرنے کے لیے آپ مجھے اپنے گھر میں پس پردہ بٹھا دیں اور ان کی نگاہوں سے مخفی رکھ کر ان کی رائے میرے بارے میں دریافت فرمائیں اور پھر ملاحظہ فرمائیں کہ میرے اسلام لانے سے ناواقف ہوتے ہوئے مجھے کیا مقام دیتے ہیں، کیونکہ اگر ان کو میرے قبولِ اسلام کا علم ہوگیا تو پھر وہ مجھ پر بہتان باندھیں گے اور عیب جوئی کریں گے۔ حضورؐ نے ایسا ہی کیا کہ عبد اللہ بن سلام کو گھر میں آڑ کے پیچھے بٹھا دیا اور ادھر یہودی بزرگ آ پہنچے۔ باتیں ہوئیں، سوالات پوچھتے رہے اور جواب دیئے جاتے رہے۔ آخر میں رسولِ خدا نے پوچھا: "حصین بن سلام تم میں سے کیسے آدمی ہیں؟" کہنے لگے کہ وہ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے ایک سردار کے فرزند ہیں، ہمارے ایک مردِ جلیل ہیں۔ ایک بلند پایہ عالم ہیں۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکے تو عبد اللہ بن سلام اوٹ سے باہر آگئے اور ان کو مخاطب کر کے کہا: "اے گروہِ یہود! خدا کا خوف کرو اور جو دین حضورؐ کے ذریعے آیا ہے اسے اپنا لو، کیونکہ خدا کی قسم تم خوب سمجھتے ہو کہ آپؐ اللہ کے فرستادہ ہیں، تم حضورؐ کے اسمِ گرامی اور آپ کی صفات کا تذکرہ اپنے ہاں تورات میں لکھا دیکھتے ہو، سو میں تو گواہی دیتا ہوں کہ حضورؐ خدا کے فرستادہ ہیں اور آپؐ پر ایمان لاتا ہوں۔ اور آپؐ کی تصدیق کرتا ہوں اور آپ کو پہچانتا ہوں۔" یہود پردہ اٹھا دینے والے اس ڈرامے کو دیکھ کر بڑے سٹپٹائے اور کہنے لگے "تم جھوٹے ہو اور پھر عبد اللہ بن سلام کے درپے ہوگئے۔ ابھی چند ثانیے پہلے جس شخص کو سید اور عالم اور مردِ جلیل قرار دیا تھا، گھڑی بھر میں اسی کو جھوٹا آدمی کہہ رہے تھے۔ عبد اللہ نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ میں نے حضور سے کہہ نہیں دیا تھا کہ یہ ایک باطل زدہ گروہ ہے یہ سرکشی، جھوٹ اور بدی سے آراستہ لوگ ہیں! اس دلچسپ طریقے سے عبد اللہ بن سلام نے اپنے اور اپنے گھر والوں کے اسلام کا اعلان کیا۔ تصور کیجیے کہ یہود کے دل و دماغ

کیا واردات گذرے ہوں گے[۱]۔

ایسا ہی ایک واقعہ مشہور بزرگ و عالم مُخَیْرِیق کا ہے جو ذرا بعد کے دور میں پیش آیا، یعنی یومِ احد پر! یہود میں سے یہ صاحب بہت مالدار بھی تھے اور کھجوروں کے باغات کے مالک تھے۔ اپنے علم کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سے وہ آپ کو پہچان گئے تھے، یہاں تک کہ یومِ احد آگیا اور اتفاق سے اسی دن یومِ سبت پڑتا تھا۔ کسی مجلس میں انھوں نے کہا کہ: "اے گروہِ یہود! خدا کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمدؐ کی مدد کرنا تم پر لازم آتا ہے"۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ اہلِ شرک کے مقابلے میں مسلم جماعت کی امداد اصولاً تم پر واجب ہے، دوسرے بروئے معاہدہ تم اس بات کے پابند ہو کہ پیش آمدہ تصادم میں اس حلیف طاقت کا ساتھ دو۔ اس پر جو جواب یہود نے دیا وہ حیلہ باز اور نکتہ طراز مذہبی ذہن کی گھناؤنی تصویر کو پوری طرح سامنے لے آتا ہے۔ کہنے لگے کہ "آج کا دن تو یومِ سبت ہے"۔ اس جواب پر درشتی سے مُخَیْرِیق نے کہا "کوئی سبت نہیں ہے تمھارے لیے"! پھر اس فرض شناس مجاہد نے ہتھیار سنبھالے اور شہر سے نکل کر میدانِ احد میں رسول اللہ سے جا ملے۔ جاتے ہوئے اپنے اہلِ خاندان سے یہ بات طے کرتے گئے کہ اگر میں آج مارا جاؤں تو میرے تمام اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دئے جائیں اور وہ اللہ کی رہنمائی کے تحت جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں۔ چنانچہ یہ جانباز میدان میں کام آگیا اور اس کے ترکہ کو رسولِ خدا نے اپنے قبضہ میں لے کر صرف کیا۔ کسی قدر اختلاف اس بارے میں ہے کہ مخیریق اسلام لائے تھے یا نہیں۔

تحریکِ اسلامی کی اس فاتحانہ یلغار پر یہود کی فاسد مذہبیت کا جو باطنی ردِ عمل تھا اس کا اندازہ اسی سلسلے کے ایک دلچسپ واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرت صفیہؓ بنت حُیَیّ بن اَخطب یہ روداد بیان کرتی ہیں کہ میں اپنے والد اور چچا کی نگاہ میں ساری اولاد سے زیادہ چہیتی تھی اور دونوں ہمہ وقت ساتھ رکھتے تھے۔ جب رسولِ خدا مدینہ آئے اور قبا میں قیام فرمایا تو میرے والد حُیَیّ بن اَخطب اور

---

[۱] سیرت ابن ہشام۔ ج ۲ ص ۱۶۲-۱۶۳

چچا ابویاسر بن اخطب منہ اندھیرے ملاقات کے لیے گئے۔ لوٹے تو غروبِ آفتاب کا وقت تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بہت تھکے ماندے اور پریشاں خاطر ہیں۔ وہ بہت دھیمے انداز سے چلے آ رہے تھے۔ میں معمول کے مطابق مسکراتی ہوئی ان کی طرف متوجہ ہوئی؛ لیکن بوجوہ پریشانی کے مارے دونوں میں سے کسی نے میری طرف التفات نہ کیا۔ میرے چچا ابویاسر والد سے کہہ رہے تھے:
"کیا یہ وہی (پیغمبر موعود) ہے؟" والد نے کہا: "ہاں، خدا کی قسم!" چچا نے پھر پوچھا: "کیا تم نے اسے پہچان لیا ہے اور یقین کر لیا ہے؟" والد نے جواب دیا، "ہاں"! اس پر چچا نے دریافت کیا "پھر اس کے لیے تمہارے دل میں کیا جذبہ ہے؟" والد نے کہا: "دشمنی ہی دشمنی ــ جب تک زندہ ہوں، خدا کی قسم!"

یہ تھا یہود کا اصل ذہن! یعنی خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے سامنے آنے والا داعیٔ حق ہے، خدا کا پیغام لانے والا ہے! اس کا ہر بول اس کی سچائی پر گواہ ہے، اس کا پورا کردار اس کے مرتبہ کو نمایاں کر رہا ہے، اس کا چہرہ اور اس کی وجاہت اس کی نبوت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ سمجھتے ہی نہیں خلوتوں میں زبان سے اقرار تک کرتے ہیں، لیکن ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کرنے کے بجائے مخالفت و عداوت کا عزم باندھتے ہیں۔ یہ فطرت یہود کے ہاں عام تھی۔ آفتاب نکلتا ہے تو کون نہیں جانتا کہ طوفانِ نور ابل پڑا۔ آدمی اور حیوانات تو خیر آنکھیں رکھتے ہیں، گھاس کی ایک پتی کو علم ہو جاتا ہے کہ وہ ہونے والا واقعہ ہو گیا جو ہر شبِ تیرہ کے خاتمے پر روز ہوا کرتا ہے، بلکہ حرارت اور گرمی مٹی کے بے جان ذروں اور پانی کے قطروں اور ہوا کی موجوں تک کو یہ معرفت دے دیتی ہیں کہ نور کا پیغامبر جلوہ آرا ہو چکا۔ طلوعِ آفتاب تو ایسا بڑا انقلابی واقعہ ہوتا ہے کہ اسے چمگادڑیں اور اُلو تک جان جاتے ہیں، ان کی فطرتِ کج کی امتیازی شان بس یہ ہوتی ہے کہ روشنی ہونے پر اور دنیا کی تو آنکھیں کھلتی ہیں اور ان کی آنکھیں بند ہو جایا کرتی ہیں، بلکہ ان کے لیے سورج کے نکل آنے کی علامت ہی یہ ہوتی ہے کہ ان کی آنکھیں چندھیا کے رہ جائیں۔ انسان اتنا اندھا نہیں ہو سکتا کہ اس کے سامنے خدا کے انبیاء مرتبۂ اعجاز کو پہنچے ہوئے علم و کردار کے ساتھ جلوہ گر ہوں اور وہ یہ نہ محسوس کر لے کہ

کوئی عظمت مآب اور غیر معمولی اہمیت کی شخصیت ابھری ہے۔ آدمی دیکھتا ہے، سمجھتا ہے، جانتا ہے اور جاننے کے بعد آنکھیں بند کرتا ہے، پھر بھی اگر روشنی پپوٹوں کے پردوں کو چیر کر اندر جا پہنچتی ہے تو آنکھوں پر پٹیاں باندھتا ہے، ہاتھوں سے ان کو بھینچ لیتا ہے، منہ ریت میں چھپا لیتا ہے، کمروں کے دروازے کھڑکیاں بند کر کے کالے پردے ان پر ڈال دیتا ہے۔ کہتے ہیں، سوتے کو جگایا جا سکتا ہے، جاگتے کو جگانا ممکن نہیں ہوتا۔ ٹھیک اسی طرح انجان کو علم دیا جا سکتا ہے، لیکن جاننے والے کو انجان بن جانے پر جہل کے عالم سے باہر نہیں نکالا جا سکا۔ ٹھیک یہی حال تھا جس میں یہود کی اکثریت اور خصوصاً ان کے علماء کبار جا پڑے تھے۔ قرآن نے بھی ان کے اس فساد کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ "یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" یعنی یہ حق اور داعی حق کو اسی قطعیت کے ساتھ جانتے ہیں جیسے اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔

یہودیت کے سربراہ کار محسنِ انسانیت کے علوِ مرتبہ کو دیکھ دیکھ کر جلتے تھے اور جوں جوں عامۃ الناس اور ان کے اپنے ریوڑ کے افراد نئی دعوت کی طرف لپک رہے تھے، ان کے دلوں کی فضا میں کھچاؤ بڑھ رہا تھا۔

مناظرانہ سوالات بگڑے ہوئے مذہب داروں کے دلوں میں جب کسی موثر دعوت اور کسی فروغ پاتی ہوئی تحریک اور کسی جلیل القدر داعی کے خلاف کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ قوام پکڑ لیتا ہے تو وہ افہام و تفہیم کے دروازے بند کر کے مناظرے کا دنگل کھول دیتے ہیں۔ مناظرے کی اسپرٹ سے جو سوالات و شکوک اٹھائے جاتے ہیں ان کا منشا کبھی یہ نہیں ہوتا کہ ایک بات کو سمجھنا ہے، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیدھی سادی بات کو سمجھ کے نہیں دینا ہے۔ یعنی مناظرے کی روح ہے "میں نہ مانوں"! لیکن مقصد اتنا ہی نہیں ہوتا، وسیع تر منتہا یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس کو طلبِ حق کی فطری راہ سے ہٹا کر شکوک و شبہات کے خارزاروں میں ڈال دیا جائے اور وہ سادہ استدلال سے دور ہو کر نظری سوالات کے چکر میں پڑ جائیں۔ وہ دعوت کی عقلی قدر و قیمت اور اس کے اخلاقی اثرات کو جانچنے کے بجائے پیچیدہ ٹکنیکل مسائل کی بھول بھلیاں میں گھومتے ہیں۔ علمائے یہود اپنے بارے میں

سو فی صدی اطمینان رکھتے ہیں کہ ہمیں دعوتِ حق کبھی ختم نہیں کر سکتی، ڈر انھیں ہوتا ہے اپنی بھیڑوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا، ان کی حفاظت کے لیے وہ ٹیڑھے ٹیڑھے سوالات کے جھاؤ کا باڑا بناتے ہیں۔ یہود کے علمائے سوء بھی اس کے سوا اور کیا کرتے؟

عبداللہ بن سلام کے تحریکِ اسلامی میں شامل ہو جانے کے بعد یہود نے مناظرانہ بحثوں اور کاوشوں کے مورچے جمانے پر پوری پوری توجہ صرف کر دی اور کج بحثیوں کے ترکش کھول کر منطقیت کے تیر تحریکِ اسلامی پر برسانے شروع کر دیئے۔ مگر یہ ساری جنگی کارروائی بھی کھلے مورچوں سے نہیں، منافقت کی ٹٹیوں سے جاری کی گئی۔ یہ بزرگانِ تقویٰ کیشِ حق پژوہی کے بڑے مرعوب کن بہروپ بھر کر تحریکِ اسلامی کے اجتماعات میں شریک ہوتے۔ پھر باتوں باتوں میں گریہ مسکینی کے طرز سے ہونٹ لٹکا لٹکا کر سوالات سامنے لاتے۔

ایک اجتماع میں حضور رسالت مآب کے سامنے انھوں نے یہ سوال رکھا: "خلق کو جب خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو آخر خود خدا تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟" دیکھا آپ نے ذہن کا ٹیڑھ!—— یہود خود اسی خدا پر ایمان رکھنے کے دعوے دار تھے، اس کے پیغمبروں کے معتقد اور اس کی کتاب کے علمبردار تھے۔ وہ خدا کو پہلے سے جانتے تھے، اس کی صفات سے آگاہ تھے، لیکن اُسی خدا کی طرف جب اسلام نے بلایا تو خدا کے بارے میں ان کے دلوں میں بڑا بھاری اشکال پیدا ہو گیا اور ان کے سوال کا گویا ظاہری مدعا یہ تھا کہ اگر یہ اشکال رفع ہو جائے تو پھر ان کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ کھل جائے۔ لیکن سوال کا ٹیڑھ بتا رہا ہے کہ مقصود طلبِ ہدایت نہیں بلکہ لوگوں کو ہدایت سے بچنے کے لیے راہِ فرار دکھانا ہے۔ آنحضور نے اس ٹیڑھے سوال کا جواب بہت ہی سیدھے طریق سے دیا، یعنی سنجیدگی سے سورۂ اخلاص پڑھ دی۔ "کہو (اے محمد) کہ اللہ یکتا ہے، وہ بے ہمہ ہے، نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اور کوئی اس کا ہمتا نہیں ہو سکتا"[1]

آیئے آپ کو ایک اور دلچسپ مجلسِ گفتگو میں لے چلیں۔ یہود کے بعض نامور مولوی ایک دن

---

[1] حیاتِ محمد: محمد حسین ہیکل مصری

حضورؐ کے حلقہ میں آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے چار سوالوں کا جواب دیجیے، پھر ہم آپؐ کی دعوت مان لیں گے اور آپ کی اطاعت قبول کرلیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اب اس عہد کی ذمہ داری تم پر ہے، پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے۔ سوالوں کے سامنے آنے سے قبل آپ ذرا خود اندازہ کیجیے کہ تحریک اسلامی کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے معقول لوگوں کی طرف سے کس قسم کے استفسارات کی توقع کی جانی چاہیے۔ وہ پوچھتے تو اساسی صداقتوں کے بارے میں پوچھتے، اسلام کی اخلاقی قدروں کے بارے میں پوچھتے، سیاسی و معاشی نظام اور اس کے طریق کار کے بارے میں پوچھتے، مسلمان ہونے کے شرائط و لوازم کے بارے میں پوچھتے، اپنی زندگیوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے علمی مسائل کے متعلق پوچھتے، لیکن ان چیزوں سے وہاں سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ انھوں نے اپنے علم و فراست کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہ سوالات یکے بعد دیگرے پیش کیے:

۱۔ بچہ ماں کے مشابہ کیوں ہوجاتا ہے، جب کہ وہ اپنے باپ کے نطفہ سے تشکیل پاتا ہے؟

۲۔ آپؐ کی نیند کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

۳۔ اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) نے کیا چیزیں اپنے اوپر حرام کرلی تھیں اور کیوں؟

ان کسوٹیوں پر تحریک اسلامی کی حقانیت کو جانچا جا رہا تھا!

چوتھا سوال البتہ کچھ نہ کچھ تعلق براہ راست دعوت و تحریک سے رکھتا تھا مگر اسپرٹ اس کی بھی ویسی ہی تھی۔ پوچھا گیا کہ 'روح (فرشتہ وحی)' کیا ہے؟

حضورؐ نے سکون سے ایک ایک سوال کا جواب دیا اور آخری سوال کے جواب میں فرمایا کہ تم خود اس بارے میں جانتے ہو کہ وہ جبریلؑ ہے اور وہی میرے پاس آتا ہے۔

سب سوالات ہوچکے، جوابات سامنے آگئے، ان جوابوں میں سے کسی کی تردید نہیں کی گئی بلکہ ہر ایک پر کہا گیا: "اللھم، نعم"! یعنی 'ٹھیک' اے ہمارے اللہ!

آپ توقع کریں گے کہ ان جوابات کے بعد انھوں نے دلوں کے دروازے اسلام کے لیے کھول دیے ہوں گے، ہرگز نہیں! آخری بات پر وہ کہنے لگے: "لیکن، اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، جبریلؑ تو

ہمارا دشمن ہے ، وہ ایک ایسا فرشتہ ہے کہ جب جب آتا ہے تو مصیبت اور خون خرابے کا پیغام لے کے آتا ہے"۔ مراد یہ تھی کہ وہ جب خدا کی طرف سے دین کی علمبرداری کا مطالبہ لاتا ہے تو ایک کشمکش ناگزیر ہو جاتی ہے ، طرح طرح کے نقصانات سر پڑتے ہیں اور بڑے چرکے کھانے پڑتے ہیں ، بلکہ نوبت جہاد تک پہنچتی ہے۔ اس سے ہماری نہیں بنتی "بس اس فرشتے کی دشمنی آڑے نہ آتی ہوتی تو پھر ہم آپؐ کا ضرور ساتھ دیتے اور آپؐ کے نقشِ قدم پر چلتے"۔ یعنی دعوت ٹھیک ، پیغام برحق ، تحریک درست ، مگر اس کے پس منظر میں جس فرشتے کو خدا نے لا ڈالا ہے اس سے ہماری صاحب سلامت ختم ہو چکی ہے ، لہٰذا جہاں وہ ہوگا وہاں ہم نہیں آسکتے !

اس کا جواب محسنِ انسانیت نے قرآن کے الفاظ میں ایسا دیا کہ بس سننے والوں کو ہمیشہ یاد رہا ہوگا - فرمایا : "کہو (اے محمدؐ) کہ جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو (وہ کان کھول کر سن لے کہ) قرآن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل پر اپنے فرمان کے تحت اتارا ہے جو اپنے سے پہلے کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے (عداوت اور مصیبت اور خون خرابے کا پیغام نہیں بلکہ) ذریعۂ ہدایت و بشارت ہے[۱]"

ایک اور بحث پیدا ہو گئی - سرورِ عالمؐ نے کسی موقع پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر سلسلۂ انبیاء میں فرمایا - اس پر یہودی حلقوں میں بڑا چرچا ہوا - ہر طرف کہا جانے لگا : "کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی انوکھی بات سنی ؟ کہتے ہیں کہ سلیمان بن داؤد بھی پیغمبر تھے ! خدا کی قسم ، وہ تو محض ایک جادوگر (نعوذ باللہ) تھے - چنانچہ قرآن نے اس واہیات چرچے کی تردید کی کہ جادوگری تو ایک کافرانہ حرکت ہے اور حضرت سلیمانؑ نے کبھی یہ حرکت نہیں کی - چاہِ بابل کے جو قصے مشہور ہیں وہ تو شیطان کے کرشمے تھے[۲]

(باقی)

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۹۲-۱۹۱ .

[۲] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۲